

روشن مستقبل کے لیے راہِ عمل

خرم مراد

برادر عزیز محترم خرم مراد مرحوم نے دسمبر ۱۹۹۶ء میں ترجمان القرآن کے لیے جو 'اشارات' لکھے تھے وہ حالات کے گہرے تجزیے، مسائل اور اُن کے حل کی راہوں کی طرف چلنے کے روشن نشانات پر مشتمل تھے اور آج بھی ان کی تازگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ ہم اس ماہ کے 'اشارات' میں خرم بھائی کی اس چشم کشا تحریر کو شائع کر رہے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں تحریک اسلامی کی قیادت اور اُس کے کارکن ان نکات پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور دُنیا اور تحریک کا احتساب کرتے وقت انھیں ملحوظ رکھیں گے۔ مدیر

اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ 'آج' کا دامن اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک یقینی روشن مستقبل کے بھرپور امکانات سے لبریز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل جو حوادث و واقعات پیش آرہے ہیں وہ مایوسی پیدا کرتے ہیں، ناکامی و مغلوبیت اور پس ماندگی کی خبر دینے لگتے ہیں۔ اپنا افتراق و انتشار اور نزاع و اختلاف اور اس کے تباہ کن نتائج دیکھ کر دل بیٹھنے لگتے ہیں۔ اغیار کی سیاسی، فوجی اور ابلاغی قوت و بالادستی اور ان کے مکرو فن کی کامیابی دیکھ کر حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود، ہمارے اس یقین میں کوئی کمی نہیں آتی کہ کل سورج طلوع ہوگا تو عزت و سر بلندی اور ترقی کی خوش خبری لے کر آئے گا، ان شاء اللہ!

آج اور کل کے واقعات سے نگاہ اُپر اُٹھا کر آج کی اور ۱۹۴۷ء کی دنیا پر ایک نظر ڈالیے، تو آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ اس نصف صدی میں ہم نے اپنی منزل کی طرف کتنی نمایاں

پیش رفت کر لی ہے۔ اسلام ایک مذہب کے مقام سے سفر کر کے مقصد حیات بن گیا ہے۔ وہ مستقبل کی اجتماعیت، ریاست اور تہذیب کے نقشہ گر کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ نسلوں کی نسلوں نے اپنی سعی و جہد، اور اپنی آرزو و جستجو کو اس مقصد کے حصول اور اس نقشہ فردا پر مرکوز کر دیا ہے۔ ملت کے جسم میں احيائے اسلام کے ساتھ وابستگی کی ایک رو دوڑ گئی ہے اور حوصلہ شکن حالات اور ناکامیوں کے باوجود الحمد للہ، یہ وابستگی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ابلیس نے جس کو فتنہ فردا قرار دیا تھا، وہ اس عالم کے لیے فتنہ امروز بن کر نمودار ہو گیا ہے۔

یہ روشن مستقبل کب طلوع ہوگا؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ اس کا علم اس کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے، جس کے پاس غیب کی ساری کنجیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے نصرت و فتح کا وعدہ ضرور فرمایا: **إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ** ﴿۱۷۳﴾ (الصافات ۱۷۳-۱۷۲) ”یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا“۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا (ترجمہ:) ”اے نبی، صبر کرو، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی ان کو ان بڑے نتائج کا کوئی حصہ دکھا دیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں، یا (اس سے پہلے) تمہیں دنیا سے اٹھالیں“ (المومن ۴۰: ۷۷)۔ ہمارے ساتھ بھی **أَنْتُمْ الْأَغْلَوْنَ** اور **لَيْسَتْ تَخْلِفُكُمْ** کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہیں گے، خواہ ہماری آنکھیں کامرانی کا یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔

جو بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ روشن مستقبل کے حصول کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے: جدوجہد کا راستہ۔ انفاق اور جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ! نصرت الہی کے بغیر تو ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا، کجا یہ کہ منزل سر ہو جائے: **إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ** ﴿الاعمذن ۳: ۱۶۰﴾ ”اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں“۔

لیکن یہ نصرت الہی صرف انھی کو حاصل ہوتی ہے، جو جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں: **إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُخْلِفَنَّ أَقْدَامَكُمْ** ﴿محمد ۷: ۷﴾ ”اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا“۔۔۔ جس سچے ایمان کے ساتھ سر بلندی کا وعدہ مشروط ہے، اس کی صداقت کی کسوٹی بھی جدوجہد ہی ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَزَلُوا وَاٰلِهِمْ
 وَآٰلِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّٰدِقُونَ ﴿١٥٠﴾ (الحجرات ۱۵:۱۴۹) حقیقت
 میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انھوں نے کوئی شک
 نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔

جدوجہد کے کئی پہلو ہیں۔ خود اپنے اندر جدوجہد کی استعداد پیدا کرنا، اور اپنی شخصیت کو
 جدوجہد کے لائق بنانا۔ انسانوں کی مطلوب ضروری تعداد کو جدوجہد کے لیے کھڑا کرنا، ان کو ایک
 قوت بنانا، ان کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں بہتر سے بہتر اور مؤثر سے مؤثر تر طریقے اور
 تدابیر سے جدوجہد میں لگانا۔ ماحول، معاشرہ، انسان اور نظام، جیسے کچھ ہیں، انھی کے درمیان اپنی
 پیش رفت اور منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ بنانا۔ اس مقصد کے لیے راستے کے امکانات و خطرات
 کا، موافق و مخالف عوامل اور قوتوں کا، حال اور مستقبل کا زیادہ سے زیادہ ممکن صحیح اندازہ کرنا۔ ایسی
 حکمت عملی اختیار کرنا، جس سے منزل مطلوب تک پہنچنا ممکن نظر آئے۔ اپنے اعمال و اقدامات کا
 جائزہ و احتساب اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر استغفار کی روش پر کاربند رہنا۔

ان کی دُعا بس یہ تھی کہ:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوِّمِ
 الْكَافِرِينَ ﴿١٤٠﴾ (العمرن ۳:۱۴۰) اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے
 درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو، اسے معاف
 کر دے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔

یہاں تک کہ فتح و نصرت دیکھ کر بھی یہی روش رہے:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ وَإِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿١١٠﴾ (النصر ۱۱۰:۳) اپنے رب کی حمد
 کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے بخشش کی دُعا مانگو۔

صرف تمنا اور خواہش سے مستقبل کی نقشہ گری نہیں ہو سکتی۔ دُعا میں بھی جدوجہد کا بدل
 نہیں بن سکتیں۔ جدوجہد کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اللہ کی نصرت اور فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔
 ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے، کہ بڑی سے بڑی جدوجہد سے بھی اللہ کی راہ میں جہاد کا

حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسانی تدبیر بھی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسانی عقل بھی ان تمام عوامل و حالات کا احاطہ نہیں کر سکتی، جو جدوجہد کی کامیابی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ کسی انسان کے بارے میں یہ ضمانت نہیں جو ایسے کامل انسان پیدا کر سکے جن کے بارے میں ضمانت دی جاسکے۔

چنانچہ جتنی خام، ضعیف اور کم معیار عقل، استعداد، ایمان اور عمل صالح میسر آئے اور جتنی بھی بُری بھلی جدوجہد بن پڑے، وہ اللہ کی راہ میں پیش کر دینا چاہیے۔ ہر صورت میں حکم اور تدبیر کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اور نتائج صرف مشیت الہی پر منحصر ہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کی نگاہ اور عقل کام کرے، وہاں تک یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جدوجہد کی کامیابی کے لیے ضروری شرائط زیادہ سے زیادہ پوری ہوں۔

اس موضوع کو سمیٹ کر ہم چند اہم اور بنیادی باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان قوتوں اور تحریکات کی توجہ کے لیے، جنہوں نے اکیسویں صدی میں غلبہ دین کی لہر پیدا کی ہے:

رضائے الہی کا حصول

سب سے ضروری اور اہم شرط اللہیت اور اخلاص ہے۔ پوری جدوجہد، اور جدوجہد کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے۔ رضائے الہی کی جستجو، جنت کی تمنا و طلب اور اس کے لیے بھاگ دوڑ اور مسابقت اسی اللہیت کی تعبیر ہے۔ قرآن میں جہاں بندگی کی دعوت ہے، وہاں مخلصین کی شرط ہے۔ اکثر مقامات پر وجہ ربہ الاعلیٰ اور مرضات اللہ کی جستجو کی تاکید ہے، اور جہاں جدوجہد کا ذکر ہے، وہاں جنت کو مطلوب و محبوب بنانے کی دعوت ہے۔ قرآن اس دعوت سے بھرا ہوا ہے۔

آج غلبہ دین کی جدوجہد کو جو بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں، ان کی بڑی وجہ ہمارے نزدیک اسی مطلوب اخلاص اور اللہیت میں کمی یا کمزوری ہے۔ یہ افراد کی سستی اور بے رغبتی ہو، تحریکوں میں جمود ہو، دنیا طلبی کا غلبہ ہو، عہدوں اور جاہ و عزت کی طمع ہو، خود رائی و خود سری ہو، نظم و ضبط کی کمی ہو، باہمی افتراق و تنازعات ہوں، دعوت الی اللہ سے لاپرواہی اور دعوت کی بے اثری ہو۔۔۔ جو بھی ہو، کھنگال کر دیکھیے تو تہہ میں یہی مرض ملے گا۔ سب سے بڑا سگلتا مسئلہ یہی اخلاص و اللہیت میں کمی کا مسئلہ ہے۔

للہیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ہر فرد کا اپنا معاملہ ہے۔ وہی اپنے اندر للہیت پیدا کر سکتا ہے، وہی جدوجہد کو للہیت کے رنگ میں رنگ سکتا ہے، وہی اس کے ہونے یا نہ ہونے کے لیے ذمہ دار اور جواب دہ ہے، اور اگر یہ نہ ہو تو نقصان بھی سراسر اسی کا ہے۔ یہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان معاملہ ہے، جو عَلَيْنَهُ يَذَاتِ الضُّوْر ہے۔ وہی صحیح علم رکھتا ہے اور فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس میں کتنی للہیت ہے؟ اجتماعی جدوجہد میں تو ہر طرح کے لوگ شامل ہونے چاہئیں، اور ہوں گے: وہ بھی جن کے دل اخلاص کی اس نعمت سے خالی ہوں، وہ بھی جن کے دل اس سے مالا مال ہوں۔ کوئی اجتماعیت ہر فرد کے اندر للہیت پیدا کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی، نہ اسے فرد کے اخلاص کو جدوجہد میں شرکت کے لیے شرط بنانا چاہیے۔

لیکن دوسری طرف اجتماعیت کو تین باتوں کا اہتمام پوری شدت کے ساتھ کرنا چاہیے:

- ایک یہ کہ، وہ تذکیر و موعظہ اور دعوت کے تمام ممکن اور رائج طریقوں سے لوگوں کو مسلسل اور تاکید کے ساتھ للہیت کی طرف راغب کرتی رہے۔
- دوسرے یہ کہ، وہ اجتماعی ماحول اور کلچر کو للہیت کے رنگ میں رنگنے کا اہتمام کرے۔ جو اس ماحول میں سانس لے، اس پر یہ رنگ چڑھے۔ وہ رضائے الہی اور جنت کی قدر و قیمت اور مطلوبیت کا خریدار بن جائے۔

- تیسرے یہ کہ، اجتماعیت اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے بارے میں فیصلے کرتے ہوئے لازماً دنیا میں ان کے نتائج کو سامنے رکھے، لیکن مجموعی طور پر نیت اور محرک صرف اللہ اور جنت کو رکھے۔ کوشش یہ کرے کہ کوئی ایسا قدم تو ہرگز نہ اٹھائے جو اللہ کو ناپسند ہو، مثلاً: تدابیر وہ ضرور اختیار کی جائیں جن کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک سفر ہوں، لیکن نیت ان کی اور اپنی اُخروی فلاح ہی رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جس قدر اخلاص بڑھے گا، للہیت رچے، بسے گی، اس کا رنگ انفرادی اور سماجی زندگی پر چھائے گا، اس قدر ہمارے مسائل حل ہوں گے، ہماری کمزوریاں اور خرابیاں دُور ہوں گی، ہمارے اندر مضبوطی اور شوق و طلب میں اضافہ ہوگا، اور ہم نصرت الہی کے مستحق بنیں گے۔

بڑے پیمانے پر دعوتی جدوجہد

دوسری اہم اور ضروری شرط یہ ہے، کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو --- ہر طرح، ہر معیار اور ہر انداز کے انسانوں کو --- دینی جدوجہد کے دائرے میں جمع کرنا، اور ان کی جو بھی استعداد و صلاحیت ہو اسے دین کے کام میں لگا دینا۔ للہیت اگر روح، مقصود اور بنیاد ہے، تو انسان دینی جدوجہد کا مرکز و محور ہے۔

ہمارے نزدیک دینی جدوجہد کا دوسرا بڑا سلگتا مسئلہ یہی ہے، کہ اس جدوجہد میں انسان کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان تک، ہر طرح کے انسان تک پہنچنے، اس کے دل میں گھر کرنے، اسے اپنا ہم نوا بنانے، اسے اپنے دائرے میں جمع کرنے، اسے اپنے ساتھ لے کر چلنے، اور اس کی استعداد و صلاحیت کو ضیاع سے بچا کر دین کے لیے کارگر بنانے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

مسلم ممالک کی مثال

بہت سے ممالک ہیں جہاں منظم دینی گروہ موجود ہیں، ان کے پاس قوت و طاقت بھی ہے، صلاحیت، نیکی اور تقویٰ بھی موجود ہے، لیکن عام معاشرہ ان کے ساتھ نہیں۔ کوئی مؤثر عوامی مزاحمت کی لہر نہیں اُٹھتی، حالانکہ حکومتیں ہزاروں کو ذبح کر دیتی ہیں، مثلاً شام میں، ہزاروں کو جیلوں میں بند کر کے تعذیب کا شکار بناتی ہیں۔ مصر میں، انتخابی عمل کو من مانے طریقے سے اپنی مرضی کے نتائج نکالنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ انڈونیشیا اور مصر میں آزادانہ انتخاب ہوتے ہیں مگر بھاری اکثریت غلبہ دین کے حامیوں کے حق میں ووٹ دینے کو تیار نہیں۔ پاکستان اور ترکیہ میں، جہاں ظلم و جبر کے خلاف ہتھیار نہیں اُٹھائے گئے اور نہ تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا ہے وہاں بھی عام آبادی نے ساتھ نہیں دیا ہے۔ الجزائر میں جتنی زبردست اور جتنی طویل مسلمہ جدوجہد برپا رہی، اس پیمانے پر کوئی عوامی مزاحمت کی تحریک ہوتی، جس میں معاشرے کا بڑا حصہ شامل ہوتا، تو کیا کوئی ظالم حکومت مقابلے میں ٹک سکتی تھی --- اس دائرے میں مطلوب کامیابی کیسے حاصل ہو؟ عام معاشرے کو کیسے اپنا ہم نوا اور ہم رکاب بنایا جائے؟ یہی آج کا دوسرا بڑا چیلنج ہے۔

اس سلگتے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کئی پہلوؤں سے غور و فکر اور اقدامات کرنے کی

ضرورت ہے۔ دینی جدوجہد میں انسان کی قدر و قیمت، اس کی ضرورت اور اس کا مقام جاننے اور تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ دین کا، اس کے پیغام اور جدوجہد کا مخاطب ہر عام انسان ہے، اُمت مسلمہ عام انسانوں کے لیے (أَخْوِجَتْ لِنَتَائِسِ) برپا کی گئی ہے۔ دینی جدوجہد کا مقصود ہر انسان کی اُخروی اور دُنوی فلاح ہے۔ دین کی دعوت اور جدوجہد انسانوں کے ذریعے ہی دوام پاسکتی ہے۔ دینی نظام انسانی ہاتھوں ہی سے چلے گا، انسانوں ہی پر قائم ہوگا اور انھی کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوگا۔

برہرہ، مہلت کا ستارا

اس لحاظ سے دیکھیے تو ہر وہ انسان قیمتی ہے جو دینی مقاصد کا کوئی حصہ بھی قبول کرے، جو دینی جدوجہد میں کسی درجے میں بھی شرکت کرنے کو تیار ہو۔ ہر انسان کو اپنے ساتھ لے کر چلنا، یہ ہر دینی جدوجہد کرنے والے کا فرض ہے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں، جو دینی مقاصد کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر گونا گوں معاشرتی و سیاسی وجوہ کی بنا پر ان کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ حمایت حاصل کرنا چاہیے، جو ضروری و مفید ہو سکتی ہے۔ جیسے جناب ابوطالب یا وہ سردارانِ قریش جو قربت یا شرافتِ نفس کی وجہ سے مظلوم و مقہور مسلمانوں کو حفاظت و پناہ فراہم کرتے تھے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں جو سخت دشمن ہوں، لیکن جن کے ساتھ آجانے سے معاشرے میں وزن کا پلڑا جھک سکتا ہو۔ جیسے ابو جہل اور عمر بن الخطابؓ، جن کے لیے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اسلام کی تقویت کا سامان کرے۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انسان اپنی صلاحیت و استعداد کے لحاظ سے، اپنے ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے اور اپنے کردار کے لحاظ سے اعلیٰ بھی ہوں گے اور ادنیٰ بھی۔ لیکن اندھا بھی ہو تو وہ توجہ اور مقام کا مستحق ہے۔ میدانِ جنگ سے پلٹ آنے والے ہوں، تو وہ بھی عفو و استغفار اور اجتماعی معاملات میں شریک رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ عبد اللہ بن ابی جیسے منافق کے ساتھ بھی اس حد تک نرم برتاؤ کیا گیا کہ ”لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں“۔

ایک بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں یقیناً وابستگی و وفاداری اور ایمان و عمل کے لحاظ سے معیاری لوگوں کی تلاش بھی ہوگی، ایسے لوگ جمع کرنے اور بنانے کی خصوصی فکر بھی ہوگی، اور

ابتدائی مراحل میں تو زیادہ اہتمام سے ہوگی، لیکن جیسے ہی انسانوں کی قوت استعمال کر کے غلبہ دین کی جدوجہد شروع ہوگی۔ ویسے ہی ہر مسلمان کو، وہ کیسا ہی مسلمان ہو، اپنے ساتھ شامل کرنا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا ضروری ہوگا۔ بنی اسرائیل کے جن ’مسلمانوں‘ کو اپنے ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے تھے۔ ذرا قرآن اور تورات میں ان کی ایمانی، اعتقادی، اخلاقی، عملی اور دینی حالت دیکھیے، تو آپ کو ہماری اس بات کی اہمیت کا صحیح ادراک ہوگا۔

روبیہ اور مزاج میں تبدیلی

ایک دفعہ انسان کا یہ مقام سمجھ لیا جائے تو رویوں، پالیسیوں اور نظام میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت خود بہ خود محسوس ہوگی اور تبدیلیاں خود بہ خود پیدا ہوں گی۔ پھر ہر شخص جس کا ساتھ دینا ضروری ہو، یا جو ساتھ دینے کے لیے تیار ہو، اس کے لیے دل کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور دائرۂ اجتماعیت کے دروازے بھی۔

اجتماعی نظام جو تحریکوں نے اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ ’نصوص‘ پر مبنی نہیں بلکہ اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان کو وضع کرنے میں ہمارے سامنے عصر حاضر کی نظریاتی تحریکوں کے نظام کے ماڈل بھی رہے ہیں۔ لیکن ہماری روایات میں اور بھی ماڈل موجود ہیں، اور آج کے دور میں اور بھی ماڈل رائج ہیں، اور نصوص کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کر کے ہم کو ایسے ماڈل وضع کرنے چاہئیں، جو ان تمام انسانوں کو مساوی شرکت کا بھرپور احساس دے سکیں، جو اس غلبہ دین کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر لینے، اور صرف معیاری لوگوں ہی کو لینے سے بہر حال وہ قلیل گروہ تیار ہوئے جو قلیل ہونے کے باوجود قوی اور مؤثر ہیں۔ لیکن اس طریقے سے تحدید و تفریق بھی پیدا ہوئی۔ جس سے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس قلیل گروہ کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس پورے مسئلے کا از سر نو جائزہ لے کر ہم مناسب دُور رس اقدامات کریں، جو عام انسانوں کو اپنے دائرے میں جمع کرنے میں مدد و معاون ہوں۔

اس سلسلے میں یہ غلط فہمی بھی دل سے نکال دینا چاہیے کہ: تعداد فی نفسہ مطلوب نہیں، یا تعداد کی طلب اور جستجو مستحسن نہیں، یا تعداد و توسیع اور معیار و استحکام میں کوئی بنیادی و منطقی تضاد ہے۔ اصل چیز تو معیار ہے، تعداد سے کیا ہوتا ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصرت و فتح کی علامت، **يَذْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا** کو قرار دیا ہے۔ اپنی اُمت کی تعداد کو حضور نے اپنے لیے باعثِ فخر قرار دیا ہے، اور اس تعداد میں اضافے کے لیے حضور رات دن کوشاں رہے ہیں۔ اور اگر دینی جدوجہد میں شریک ہونا ہی نارجہتم سے نجات اور جنت میں داخلے کا سب سے یقینی راستہ ہے، تو اس راستے کو کسی کے لیے بند کیوں کر کیا جاسکتا ہے، یا کسی کو انتظار و تعویق میں کیوں کر ڈالا جاسکتا ہے؟

دعوتی اسلوب میں دلکشی

یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے، کہ ایسی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ محض انسان کو مرکز بنانے، اس کا مقام تسلیم کرنے، ہر طرح کے انسان کے لیے دل اور اجتماعیت کے دروازے کھول دینے سے، ایک عام معاشرہ بڑی تعداد میں کسی نہ کسی طرح دینی جدوجہد میں شامل ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ایسے انداز و اسلوب میں وہ دعوت بھی ضروری ہے جو دلوں کو مسخر کر سکے، اور وہ قیادت بھی مطلوب ہے جو دلوں کو جیت سکے۔ اس کے بعد بھی ماحول، حالات اور مشیت الہی پر ہی کامیابی کا انحصار ہوگا۔

قوت کا سرچشمہ

ہمیں یقین ہے کہ اگر ایک دفعہ ہم نے اس بات کو سمجھ لیا کہ معاشرہ اور انسان کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں، اسی معاشرے اور انھی انسانوں میں سے وہ قوت پیدا کرنا ہے، اور وہ پیدا ہو سکتی ہے، جو اصلاح و تبدیلی اور غلبہ و سر بلندی کا کام کر سکے۔ اللہ کی نصرت کے بعد، کامیابی کا راز انسانی قوت میں پوشیدہ ہے، نہ کہ مال و اسباب اور اسلحہ و سامان میں: **هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِتَضَرُّعٍ ۖ وَالْبَأْسَاءِ وَالضَّرِّ ۖ ﴿۸﴾** (الانفال: ۸) ”وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمہاری تائید کی“، اور **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْبُؤْسَيْنِ ﴿۸﴾** (الانفال: ۸) ”اے نبی! تمہارے لیے اور تمہارے پیرواہل ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے۔“

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مومنین کی اس جماعت میں لوگوں کے مقام اور درجات کا تعین اللہ کے لیے ان کی وفاداری و قربانی سے ہوا کرتا تھا۔ ایمان، عمل صالح اور تقویٰ تو وہ

کی خاطر۔ پاکستان میں آپ گھوم پھر کر دیکھ لیجیے، شاید ہی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوگی جو مخالف کیمپ سے ٹوٹ کر آئے ہوں اور اب دین کے غلبے کو مقصد زندگی بنا لیا ہو۔ طالبان کا گروہ خالص قیام شریعت کا دعوے دار ہے۔ ایک طرف طائف کا سفر دیکھیے اور ثقیف کے وفد کا خیر مقدم۔ سردارانِ قریش کے مظالم دیکھیے اور لَا تَنْفَرُوا عَلَیْكُمْ الْیَوْمَ کی صدا، اور دوسری طرف [ان کے ہاتھوں سابق افغان صدر] نجیب اللہ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر اپنے جوش انتقام اور حمیت دینی کی دستکین کا سامان کرنا دیکھیے، جو اقوام متحدہ کی پناہ میں تھا، نہتا تھا اور غیر مسلم بھی نہیں تھا! حالانکہ مشرک بھی امان طلب کرے تو اسے امن تک پہنچانے کا حکم ہے۔

صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم سے کم سے کم نسبت کے حصول کے بغیر انسان جمع نہ ہوں گے، مخالفین کے دل مسخر نہ ہوں گے، اسلام کے غلبے کے لیے قوت فراہم نہ ہوگی، اور اس طرح دین کا قیام ایک امر محال ہوگا۔ خواہ ہمارے پاس اسلحہ کے ڈھیر ہوں، سیاسی اقتدار بھی ہو، دلائل کا انبار بھی ہو۔

اختلاف اور حسن اختلاف

چوتھا مسئلہ اختلافات کا افتراق و نزاع بن کر وحدت اور شیرازہ بندی کو غیر معمولی نقصان پہنچانے کا مسئلہ ہے۔ اختلافات کے باوجود متحد رہنے، ساتھ مل کر کام کرنے اور دینی قوتوں کو متحد رکھنے کا مسئلہ ہے۔ جہاں انسان جمع ہوں گے، وہاں اختلافات لازماً ہوں گے۔ رائے کے اختلافات ہوں گے، مزاج اور مفادات کے بھی۔ ان اختلافات سے کوئی مفر نہیں۔ دو صحابہؓ میں بھی اس سے مفر نہیں تھا۔ سفیہ بنی ساعدہ سے لے کر جنگِ جمل و صفین تک کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

اختلافات سے بچنا ممکن نہیں، لیکن اختلافات کو افتراق و تنازع اور مخالفت بننے سے روکنا ممکن ہے۔ لَا تَنْفَرُوا اور لَا تَنْتَازِعُوا ہی کی تاکید قرآن مجید نے فرمائی ہے۔ لیکن اس پہلو سے بھی مسلمان بہ حیثیتِ مجموعی، اور خاص طور پر دینی جدوجہد کرنے والے، جن کمزوریوں کا شکار ہیں وہ عیاں ہیں۔

اختلافات کے باوجود بڑے اور عزیز تر مقاصد کی خاطر متحد رہنے کے لیے سب سے بڑھ کر اخلاص و للہیت اور نفس پر ضبط و قابو درکار ہے۔ اس کی یقیناً کمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ

مناسب تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے، تاکہ لوگوں کو اجتماعی زندگی میں اختلافات کا مقام معلوم ہو، اختلاف کی حدود و آداب سے واقفیت ہو، ان آداب و حدود کی پابندی کی استعداد پیدا ہو، جھٹ سے، حلال و حرام اور حق و باطل اور کفر و اسلام کے فتوے جاری کرنے کے طریقے کو ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ تدبیری امور ہوں یا اجتہادی مسائل، اپنی رائے کو حتمی اور آخری سمجھنے کی خود سری پر قابو پانا ضروری ہے۔ اعجاب المرء بواہ (اپنی رائے کو سب سے بہتر سمجھنا) ہلاکت کا سامان ہے۔ ہر اختلاف کو حق و باطل کا مسئلہ بنا لینے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اجتماعی زندگی میں اپنی رائے کو صحیح سمجھنے کے باوجود اس کے غلط ہونے کے احتمال، اور دوسری رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود اس کے صحیح ہونے کے احتمال کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

اختلافات کے حدود و آداب کی پابندی اور اختلاف کے دائرے تک محدود رکھے بغیر، نہ کسی اجتماعی قوت کے مضبوط بننے کا امکان ہے، اور نہ اس کا امکان کہ وہ معاشرے کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ جمع کر لے۔

اجتہادی مزاج و بصیرت

پانچواں مسئلہ، اجتہادی امور اور تدابیر کو نصوص کا درجہ دینے، بنیادی اور اصل مقاصد کے بجائے جزئیات و فروعات پر توجہ اور مساعی کو مرکوز کرنے، اور پھر دینی احکام میں غلو، تشدد اور بال کی کھال اُتارنے پر اصرار کا مسئلہ ہے۔ اُمت میں تو یہ مرض عام ہے، اور اس کے زوال اور انتشار کا ایک بڑا سبب ہے۔ افسوس کہ دینی قوتوں میں بھی اس مرض کا غلبہ صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اپنی ابتدائی تحریروں، مثلاً: نحر یک اسلام کی اخلاقی بنیادیں میں بڑے سوز و درد مندی سے، شدت اور اہتمام سے، مضبوط دلائل کے ساتھ، اس مرض کے خلاف جہاد کیا، لیکن اس سے چھٹکارا نہیں ہو سکا ہے۔

اس مرض کی وجہ سے صرف غلو اور تعمق کی بیماریاں ہی نہیں پیدا ہوتیں، جو شاہ ولی اللہ کے بقول دین میں انحراف کا باعث ہیں۔ افتراق و انتشار میں اضافہ ہی نہیں ہوتا، توجہ اور وسائل انسانی کا ضیاع ہی نہیں ہوتا، بلکہ اصل کام اور اصل مقصد بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور جدوجہد کے لیے کھڑے ہونے والے لوگ ان گلی کوچوں میں اس طرح بھٹک جاتے ہیں، کہ بساط زندگی

میں ان کے سب مہرے مات کھا جاتے ہیں۔

اقبال، ابلیس کی زبان سے مسلمان کی بربادی کے لیے یہی نسخہ تجویز کرتے ہیں، تاکہ:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
کیا مسلمان کے لیے کافی نہیں اس دور میں یہ الہیات^۱ کے تراشے ہوئے لات و منات
ہے وہی شعر و تصوف^۲ اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

۱ اور فقیہات ۲ اور بحث و نزاع

امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق، جب ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں لوگ اسی مقام پر نوافل پڑھنے لگے جس مقام پر فرائض پڑھتے تھے، تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے انھیں متنبہ فرمایا کہ پچھلی اُمتیں اسی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ انھوں نے احکام و مطالبات کے درجات میں خلط ملط ہو جانے کے اسی مرض کی نشان دہی کی تھی، اور حضورؐ نے ان کی بات کی تصدیق فرمائی تھی۔

دینی احکام و مطالبات کے ضمن ہی میں نہیں، دیگر اجتماعی امور میں بھی یہ مرض دیکھا جاسکتا ہے۔ چیز کو ذرائع کا مقام --- مثلاً تنظیم، اجتماعات، اپنے طے کردہ وظائف و فرائض اور پروگرام --- وہ خود مقصد بن گئے ہیں۔ تدابیر کا دائرہ تنگ اور محدود ہو گیا ہے، اور ان میں تبدیلی و تغیر انتشار کا باعث بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اپنے اختیارات کو نصوص کا، اور تدابیر کو اصول کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ان سلگتے مسائل کو حل کیے بغیر نہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہوگا، نہ ذرائع مطلوبہ نتائج دیں گے، نہ متحد و متفق رہ کر حالات کے تغیر کے ساتھ مناسب احوال، حکمت عملی اور تدابیر کا اختیار کرنا ممکن ہوگا۔

دوست زیادہ، دشمن کم

ایک اور سلگتا مسئلہ اتحاد اور یک جہتی کا ہے۔ اُمت اور معاشرے میں بھی، دینی قوتوں میں بھی، اور مشترک مقاصد کے لیے سیاسی قوتوں میں بھی، مسلم معاشرے ہر جگہ مختلف نوعیت کے تفرقوں اور انتشار کا شکار ہیں۔ دینی فرقہ وارانہ اختلافات بھی ہیں اور سیاسی اختلافات بھی، جنھوں نے اُمت کو باہم نیرد آزا گروہوں میں پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ تصادم اور خون ریزی بھی ہے، ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہیں۔ سب سے زیادہ الم ناک بات یہ ہے کہ وہ تحریکات جو غلبہ دین

کی جدوجہد کے لیے ہی برپا ہوئی ہیں، وہ بھی یک جان و متحد ہو کر کام کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا ہم نے افغانستان میں دیکھا، جیسا ہم برطانیہ، یورپ اور امریکا میں دیکھ رہے ہیں۔ جو معاشرے تفرقے اور انتشار کا شکار ہوں، ان کی بڑی تعداد کو کسی دینی مقصد اور دینی قوت کی پشت پناہی کے لیے کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔

سب سے پہلا ضروری کام تو یہ ہے، کہ جہاں تحریکی قوتوں کے متحد و مشترک ہو کر کام کرنے سے نتائج میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے، وہاں عدم اتحاد کے اسباب کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اور مشترک جدوجہد کے لیے نظام اور لائحہ عمل وضع کرنا بھی ضروری ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ اختلافات ہیں، ان کو کم کرنے کے لیے تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے، اور سیاسی تدابیر بھی۔ جہاں سیاسی مقاصد کا حصول پیش نظر ہے، وہاں پیش نظر رہنا چاہیے کہ سیاسی کش مکش کا، جنگ کی طرح، بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حلیف بنائے جائیں اور کم سے کم لوگوں کو مخالف اور حریف بننے کا موقع دیا جائے۔ کم سے کم محاذ کھولے جائیں اور ایک دشمن کو شکست دینے کے بعد دوسرے دشمن کا رخ کیا جائے، ساتھ مل کر اقدامات کرنے کے دروازے کبھی بند نہ کیے جائیں اور عداوت کی آگ کسی طرح نہ بھڑکنے دی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمت عملی اسی اتحاد اور تحلیف کی جستجو اور قیام کی بہترین مثال ہے۔ معاہدہ مدینہ کے ذریعے یہود کو ساتھ ملانا، کافر قبائل سے معاہدے کر کے ان کو حلیف بنانا، یا کم از کم ان کی عداوت کے امکانات و مواقع کو ختم کرنا، دوستوں کو دوست رکھنا، دشمنوں کو دوست بنانے کی ہر ممکن تدبیر کرنا۔

مؤثر سیاسی حکمت عملی

ساتواں مسئلہ، ایسی مؤثر سیاسی جدوجہد کرنا ہے، جو مطلوب نتائج کا پھل دے سکے۔ سیاست بھی ایک ذریعہ ہے، معاشرے میں قوت و طاقت کے سرچشموں میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے، یا انھیں اپنے ہاتھ میں لینے کا۔ باوجود اس کے کہ سیاست کو دینی جدوجہد میں مرکزی مقام دیا گیا ہے، اور ہمارے نزدیک صحیح دیا گیا ہے۔ اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ بیش تر جگہ سیاست کے نتیجے میں وہ قوت نہیں حاصل ہوئی، جو مطلوب تھی۔

اس اہم مسئلے کے بھی کئی پہلو ہیں:

• ایک: اب تک دین و سیاست کی تفریق سے سوچ اور فکر پاک نہیں ہو سکی۔ چنانچہ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ ”سیاست زیادہ ہورہی ہے، یا زیادہ سیاسی ہو گئے ہیں“۔ حالانکہ جو کام بھی اللہ کے لیے، اللہ کے حکم کے دائرے میں ہو، وہ خالص دینی کام ہے، خواہ قتال و ملک گیری جیسا سیاسی و دنیوی کام ہو۔ اور جو کام للہیت سے خالی ہو یا احکام الہی کی خلاف ورزی پر مبنی ہو، وہ دنیوی اور سیاسی کام ہے، خواہ شہادت اور تعلیم قرآن جیسا بظاہر دینی کام ہی کیوں نہ ہو۔

• دوسرے: سیاست کا مقصد دینی مقاصد کا حصول ہونا چاہیے۔ جو سیاست ان مقاصد کے لیے ہو، وہ دینی سیاست ہے، عبادت ہے۔ لیکن سیاسی تدابیر کو، جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی نہ ہوں، احکام دینی کا مقام دینے کی روش صحیح نہیں، مگر یہ روش بھی بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اس طرح دینی قوتوں کا دائرہ عمل بھی محدود ہو جاتا ہے اور دائرہ حمایت بھی۔ تدابیر میں حالات کی مناسبت سے تغیر و تبدل کے بغیر کبھی بھی کامیاب سیاست نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تغیر و تبدل ناممکن ہو جاتا ہے۔

• تیسرے: کامیاب سیاست کے لیے واضح اہداف بھی ضروری ہیں، واقعات اور حالات پر گرفت بھی۔ مستقبل کے بارے میں صحیح اندازے اور پیش بینی بھی۔ پھر اگر مستقبل کے اندازے صحیح نہ نکلیں تو ان میں ترمیم کر لینا، اور تبدیل شدہ حقائق کے مطابق تدابیر کو ڈھال دینا، یہ بھی ضروری ہے۔ اگر اپنی تدابیر کے نتیجے میں ہم اپنے کو بندگی میں پائیں، تو اپنے حالات و معاملات کے فہم اور انداز سیاست پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

• چوتھے: معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش یقیناً ضروری ہے، لیکن جیسا بھی معاشرہ، عمل اور حقیقت کی دنیا میں موجود ہو، اسی معاشرے میں اپنے لیے پیش رفت کا راستہ نکالنا بھی ضروری ہے۔ معاشرہ بھی انھی لوگوں کے قابو میں آئے گا، وہی اس پر حکومت کر سکیں گے، جو ایک نظریاتی و مثالی معاشرے کے قیام کے لیے بے سود تلاش و انتظار چھوڑ کر ایک واقعی و حقیقی انسانی معاشرے میں سے اپنے لیے قوت فراہم کر سکیں، اور اس معاشرے کو چلا بھی سکیں۔ جو اپنے سے مختلف لوگوں کو اپنے ساتھ چلانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں،

وہ نہ کامیاب سیاست کر سکتے ہیں اور نہ کامیاب حکومت۔

آخری بات یہ کہ، سیاست صرف حکومتی اور انتخابی سیاست کا نام نہیں۔ حکومت کا اقتدار ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کی وجہ سے اور معاشرے میں طاقت کے دوسرے سرچشموں کی وجہ سے بھی محدود ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سیاست کے دائرے کو حکومت اور انتخابات سے وسیع کر کے اس میں معاشرے اور ریاست کے تمام قوت و طاقت اور اثر و رسوخ کے حامل اداروں کو شامل کریں۔

مغرب سے مقابلے کی راہ

آٹھواں مسئلہ: مغرب کی فوجی، سیاسی، ثقافتی، علمی اور ابلاغی بالادستی اور تسلط کا مسئلہ ہے۔ عالمی قیادت تقریباً تین سو سال سے اہل مغرب کے پاس ہے۔ زبان ان کی ہے، اصطلاحات ان کی ہیں، ادارے ان کے ہیں، قوانین ان کے ہیں، تجارت ان کی ہے، عالمی تجارت پر ان کا کنٹرول ہے۔ ذرائع ابلاغ ان کے قبضے میں ہیں، اور اپنی فوجی قوت کو وہ ناقابل شکست سمجھتے ہیں۔ لبرلزم، منڈی کی معیشت اور مغربی جمہوریت کی فتح اور عالمی غلبے کو وہ اپنی حتمی فتح قرار دیتے ہیں۔

غلبہ دین کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی قیادت، اہل مغرب کے بجائے اہل اسلام کے ہاتھ میں آئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اتنا عظیم الشان تغیر کیسے واقع ہوگا؟ دینی جدوجہد کرنے والوں نے اس مقصد کے لیے کیا حکمت عملی وضع کی ہے؟ ہمارے نزدیک ہمارے پاس نعرے ہیں، جذبہ ہے، محنت ہے، جدوجہد ہے لیکن اس سے نبٹنے کے لیے کوئی واضح حکمت عملی نہیں ہے اور شاید کسی واضح لائحہ عمل پر کاربند نہیں۔

اس ضمن میں ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے: کیا یہ تبدیلی قوت کے بل پر آسکتی ہے؟ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نہیں۔ کیا یہ تبدیلی اہل مغرب کے دل و دماغ جیت کر آسکتی ہے؟ اس مقصد کے لیے ہم کچھ نہیں کر رہے۔ کیا یہ تبدیلی آئے بغیر آج، عالمی معیشت، عالمی مفادات، عالمی عسکری و سیاسی غلبے کے اس دور میں، کیا دنیا کے کسی ایک ملک میں دینی تبدیلی آسکتی ہے؟ ہمیں اس میں شبہ ہے۔

مشیت الہی نے نصف صدی میں لاس اینجلس سے لے کر اتنبول تک مغرب کی سرزمین

میں جو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں پھیلا دی ہیں، ان آبادیوں میں یہ صلاحیت اور امکان موجود ہے کہ وہ مغرب کے ساتھ کش مکش میں فرٹ لائن کا کردار ادا کریں۔ کیا ان آبادیوں کو استعمال کرنے کے لیے ہم کوئی حکمت عملی رکھتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔

پھر مغرب نے ہمیں ایک اور اہم مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ کیا مغرب نے تہذیب و تمدن اور ٹکنالوجی میں جو ایجادات و اختراعات کی ہیں، جو افکار و خیالات پروان چڑھائے ہیں، جو ادارے اور ذرائع وضع کیے ہیں، وہ سب کفر ہیں، اور مسترد کیے جانے کے قابل؟ یا ان میں ترک و اختیار کی پالیسی اختیار کی جائے گی؟ کیا اسلامی انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو جسے مغرب نے تعمیر کیا ہے، پہلے ڈھا دیا جائے، پھر ملبہ صاف کیا جائے گا، اس کے بعد نئے افکار اور اداروں کی دیواریں اٹھائی جائیں گی؟ کیا حقیقت کی دنیا میں یہ عمل کرنے کا کوئی امکان ہے؟ ہمارے خیال میں نہیں ہے۔

مغرب کے ساتھ تہذیبی کش مکش اور اس میں فتح، بہت بڑا مسئلہ ہے۔ صرف نعروں، ہنگاموں اور جذبات کے اظہار سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ اس کے لیے علم و حکمت، اجتہاد اور جہاد تینوں کی ضرورت ہوگی۔

دین اور خواتین

نواں مسئلہ عورت اور نوجوان کا ہے۔ عورت آبادی کا نصف حصہ ہے۔ ایک طرف مسلم معاشروں میں اسے وہ مقام حاصل نہیں جو اسلام نے اسے دیا ہے، یا اسلام کی رُو سے اسے دیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف مغرب نے معاشرے میں عورت کے مقام اور عورت مرد کے تعلقات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے، انھیں بالکل نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ آنے والے زمانے میں تہذیبی مسائل میں عورت کا مسئلہ سرفہرست ہوگا: اس کا مقام اور اس کے حقوق۔ اس مسئلے پر بھی ہمارے ہاں بڑا فکری اور عملی خلا ہے، جس کو پُر کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح مسلمان معاشروں میں آبادیوں کا نصف سے زیادہ حصہ ۳۰ سال سے کم عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ان نوجوانوں کو اپنے ایمان و اقدار اور اپنی تہذیب و ثقافت کا وارث بنائے بغیر غلبہ دین کے مقصد میں کامیابی کا خواب نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن اسلامی تحریکات

اس مقصد کے لیے بھی کوئی واضح فکر اور لائحہ عمل نہیں بنا سکی ہیں۔

احتساب و اعتراف

آخری مسئلہ خود احتسابی، اپنی غلطیوں کے اعتراف، اور اپنی اصلاح کا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ احتساب پر سارے زور کے باوجود، غلبہ دین کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اور تحریکیں، اپنی اجتماعی روش، پالیسیوں اور اقدامات کے سلسلے میں احتساب و استغفار کے بجائے تاویل و پردہ پوشی کو ترجیح دیتی ہیں۔ نصف صدی کے عرصے میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی اجتماعیت نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا ہو، اور ان کی اصلاح کا اعلان کیا ہو۔ حالانکہ قوموں اور جماعتوں کی دُنیوی کامیابیوں میں خود احتسابی اور استغفار کو قرآن مجید نے کلیدی اور مرکزی مقام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کو خا میوں اور غلطیوں سے مفر نہیں۔ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ کسی انسانی گروہ سے نصف صدی میں کوئی بڑی غلطی نہ سرزد ہوئی ہوگی۔ ہمارے ہاں دنیا بھر کی خرابیوں اور غلطیوں پر قراردادیں مل جائیں گی، اپنی خرابیوں اور غلطیوں پر کوئی قرارداد نہیں ملے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ پبلک میں اور پبلک کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کو پبلک کے سامنے ہی اپنا احتساب کرنا چاہیے، اپنی غلطیوں کی تاویل یا پردہ پوشی کے بجائے ان کا اعتراف کرنا چاہیے، اپنی اصلاحی تدابیر کا اعلان بھی کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی عزت، دلوں میں مقام اور ان کے دائرہ اثر و حمایت میں کمی نہیں آئے گی بلکہ اضافہ ہوگا۔ صحت مند اور مفید روایات قائم ہوں گی۔ رگوں میں نیا خون دوڑے گا اور اصلاح کے دروازے کھلیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ غلبہ دین کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر جائزے، غور و خوض، نظر ثانی، تجدید یا تغیر کا عمل شروع ہو جائے گا تو نصف صدی کی محنت سے جو پھل ہم نے جمع کیے ہیں، وہ گلنے اور ضائع جانے کے بجائے برگ و بار لائیں گے۔ قوموں اور جماعتوں کے لیے اخطاط، زوال اور ہکا بکا مقرر نہیں، نہ جمود اور تعطل۔ اجتہاد و جہاد سے قوت اور شباب کے دروازے کھل سکتے ہیں

مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَا فَوْقَ ذَلِكَ بِاللَّهِ۔

خوفِ خدا اور وفاداری

سب سے پہلی اور سب سے بڑی خرابی تو ہمارے معاشرے کا خوفِ خدا و آخرت کی جواب دہی سے عاری ہونا ہے اور دوسری بڑی خرابی معاشرے کی اکثریت میں وفاداری کا مفقود ہونا ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی اکثریت خدا کو بھول بیٹھی ہے اور آخرت کا تصور اس کے ذہن سے بالکل ہی نکل گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے مہار اُونٹ ہے، جس کا حال یہ ہے کہ جس طرف اس کا دل چاہتا ہے، وہ بھاگ نکلتا ہے، اور جس چیز پر اُس کا منہ پڑتا ہے، وہ اسے کھا جاتا ہے۔ کوئی اسے روکنے والا نہیں، اور نہ اسے کسی کی پوچھ گچھ کا احساس ہے۔

باقی رہا وفاداری کا مسئلہ تو یہاں وفاداری بشرطِ مطلب براری ہے۔ آج آپ سے مطلب ہے تو آپ کی حاشیہ برداری فرض بن جائے گی۔ آپ جب تک اقتدار پر ہیں، کوئی آپ کی مرضی کے خلاف ذم نہیں مار سکے گا۔ اور ادھر انھیں احساس ہوا کہ آپ کے ہاتھ سے اقتدار چھن رہا ہے، یا اب آپ انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، تو فوراً چولا بدلیں گے، اور اُس کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے، جو نیا آقا بننے والا ہے، یا جس کے بننے کی توقع ہے۔ آپ اپنے سب سے قریبی دوست کی وفاداری پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ نہ معلوم وہ کب آپ کو دھوکا دے جائے! ہمارے لوگ ذرا سے فائدے پر ایک دوسرے کے لیے بڑے سے بڑا جرم کر جاتے ہیں، اور پھر اس پر بے حیائی سے فخر بھی کرتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ

مودودی

(۲۹ جون ۱۹۵۷ء)

عطیہ اشتہار: صوفی بابا